سارا بار دیاناتھ پر چھوڑ کر بے فکر ہو جاتا' لیکن اس وقت وہ اپنے ہی بنائے ہوئے جال میں پھنس گیا تھا۔ کیسے نکلے؟

اس نے کتنی ہی تدبیریں سوچیں' لیکن ایسی کوئی نہ تھی جو آگے چل کر اسے الجھن میں نہ ڈال دیتی۔ یکا یک اسے ایک چال سوجھ گئی۔ اس کا دل اچھل پڑا لیکن جالپا کے ساتھ دغا یا فریب کرنے کا خیال بھی اسے ذلت آمیز معلوم ہوا۔

دیاناتھ نے پوچھا ''کوئی تدبیر سوجھی؟''

''مجھے تو کچھ نہیں سوجھتا؟''

''مگر کوئی تدبیر تو سوچنی ہی پڑے گی۔ کیوں اس سے دو چار عدد مانگ نہیں لیتے۔ یہ تو ایسا مشکل کام نہیں۔''

''مجھے شرم آتی ہے۔''

''تم بھی عجیب آدمی ہو۔ نہ خود مانگو گے' نہ مجھے مانگنے دو گے' تو آخر یہ کام کیسے پار لگے گا؟ میں تم سے ہزار بار کہہ چکا ہوں کہ مجھ سے کوئی امید مت رکھو۔ اپنی زندگی کے آخری دن جیل میں نہیں کاٹنا چاہتا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ اس میں شرم کی کیا بات ہے۔ کس کی زندگی میں ایسے موقع نہیں آتے۔ تمہی اپنی ماں سے پوچھو۔''

جاگیشری نے اس کی تائید کی۔ ''مجھ سے تو یہ نہیں دیکھا جاتا تھا کہ گھر کے لوگ پریشان ہوں اور میں زیور پہنے بیٹھی رہوں۔ نہیں تو آج میرے پاس گہنے ہوتے۔ شادی میں پانچ ہزار سے کم کا چڑھاوا نہیں گیا تھا' مگر پانچ ہی سال میں سب صاف ہو گیا۔''

دیاناتھ نے فیصلہ کن لہجہ میں کہا۔ ''شرم کرنے کا یہ موقع نہیں ہے۔''

رماناتھ نے جھینپتے ہوئے کہا۔ ''مانگ تو میں بھی نہیں سکتا۔ ہاں! کہیے 'اٹھالاؤں؟''

دیاناتھ نے حیرت میں آکر پوچھا۔ ''اٹھالاؤ گے اس سے چھپا کر۔''

رما نے ترش ہوکر کہا۔ ''اور آپ کیا سمجھ رہے ہیں؟''

دیاناتھ نے پیشانی پر ہاتھ رکھ لیا اور ایک لمحے کے بعد بولے۔ ''نہیں میں نے چال کبھی نہیں کیا اور نہ کبھی کروں گا۔ چال کروں۔ اپنی بہو کے ساتھ' چھی' چھی' ۔ جو کام آسانی سے ہوسکتا ہے' اس کے لیے فریب! کہیں اس کی نگاہ پڑ گئی' تو تمہیں دل میں کیا سمجھے گی۔ مانگ لینا اس سے کہیں بہتر ہے۔''

رما نے کہا۔ ''آپ کو اس سے کیا مطلب! مجھ سے چیزیں لے لیجیے گا۔ مگر جب آپ جانتے تھے کہ ایک دن یہ نوبت آئے گی' تو اتنے زیور لے جانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ مفت کا دردِ سر مول لیا۔ اس کھانے سے کیا فائدہ کہ پیٹ میں درد ہونے لگے۔ میں تو سمجھ رہا تھا، کہ آپ نے کوئی راستہ نکال لیا ہوگا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ آپ یہ زحمت میرے سر ڈال دیں گے۔ ورنہ میں ان تمام چیزوں کو کبھی نہ لے جانے دیتا۔ یہی تو ہوتا کہ ادھر والوں کو شکایت ہوتی' مگر شکایتوں سے ہمارا کیا نقصان تھا۔ یہ تو گناہ بے لذت ہوا۔ بدنامی الگ ہوئی۔ پریشانی الگ۔ میں یہ نہیں دکھانا چاہتا کہ ہم سب اتنے پھٹے حال میں ہیں۔ چوری ہوجانے پر تو صبر کرنا ہی پڑے گا۔''

دیاناتھ چپ ہوگئے۔ اس جوش میں رما نے انہیں خوب کھری کھری سنائیں

اور وہ چپ چاپ سنتے رہے۔ آخر جب نہ سنا گیا تو اٹھ کر پھر کتب خانے میں چلے گئے۔ یہ ان کا روز کا دستور تھا، جب تک دو چار رسالے نہ پڑھ لیں، ان کا کھانا ہضم نہ ہوتا تھا۔ اس گوشۂ عافیت میں پہنچ کر وہ گھر کی فکروں سے آزاد ہو جاتے تھے۔

آخر رما بھی وہاں سے اٹھا، پر جالپا کے پاس نہیں بلکہ اپنے کمرے میں گیا۔ اس کا کوئی کمرہ الگ تو تھا نہیں، ایک ہی مردانہ کمرہ تھا۔ اسی میں دیا ناتھ اپنے دوستوں سے گپ شپ کرتے۔ دونوں لڑکے پڑھتے اور ماا حباب کے ساتھ شطرنج کھیلتا۔ رما کمرے میں پہنچا تو دیکھا۔ دونوں لڑکے تاش کھیل رہے ہیں۔ گوپی کا تیرھواں سال تھا۔ بشمبر کا نواں۔ دونوں رما سے تھر تھر کانپتے تھے۔ رما خود خوب تاش اور شطرنج کھیلتا، مگر بھائیوں کو کھیلتے دیکھ کر اس کے ہاتھ میں کھجلی ہونے لگتی تھی۔ خود چاہے دن بھر سیر پسپاٹے کیا کرے، مگر کیا مجال کہ دونوں بھائیوں میں سے کوئی باہر نکلے۔ دیا ناتھ خود لڑکوں کو کبھی نہ مارتے تھے۔ موقع ملتا تو ان کے ساتھ کھیلتے تھے۔ انہیں کنکوے اڑاتے دیکھ کر ان کے بچپن کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔ دو چار پیچ لڑا دیتے۔ اس لیے لڑکے رما سے جتنا ڈرتے تھے، اتنا ہی باپ سے محبت کرتے تھے۔

رما کو دیکھتے ہی لڑکوں نے تاش کو ٹاٹ کے نیچے چھپا دیا اور پڑھنے لگے، مگر کن انکھیوں سے سر پر پڑنے والی چپت کا انتظار کر رہے تھے۔

رما نے مونڈھے پر بیٹھ کر گوپی ناتھ سے کہا ''تم نے بھنگ کی دکان دیکھی ہے نہ کیڑ؟''

گوپی ناتھ خوش ہو کر بولا ''ہاں' دیکھی کیوں نہیں؟''

''جا کر چار پیسے کا مجون لے لو اور آدھ سیر مٹھائی بھی لیتے آنا۔''

گوپی روپیہ لے کر بازار چلا گیا۔

(7)

رات کے دس بج گئے تھے' جالپا کھلی چھت پر لیٹی ہوئی تھی۔ جیٹھ کی مدھم چاندنی رات میں سامنے گنبد مینار اور درخت' خواب کی تصویروں سے معلوم ہوتے تھے۔ جالپا کی آنکھیں چاند کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں چاند کی طرف اڑی جا رہی ہوں۔ اسے اپنی ناک میں کھجلی' آنکھوں میں جلن اور سر میں چکر کا احساس ہو رہا تھا۔ کوئی بات ذہن میں آتے ہی بھول جاتی اور بہت یاد کرنے پر بھی یاد نہ آتی۔ ایک بار گھر کی یاد آئی۔ رونے لگی۔ ایک ہی لمحہ میں سہیلیوں کی یاد آ گئی۔ ہنسنے لگی۔

دفعتاً رما ناتھ ایک پوٹلی لیے مسکراتا ہوا آیا اور چارپائی پر بیٹھ گیا۔

جالپا نے اٹھ کر پوچھا ''پوٹلی میں کیا ہے؟''

''بوجھ جاؤ تو جانوں۔''

''ہنسی کا گول گپا ہے۔'' یہ کہہ کر ہنسنے لگی۔

''غلط۔''

''تو پریم کی پٹاری ہو گی؟''

رما نے کہا ''ٹھیک آج میں تمہیں پھولوں کی دیوی بناؤں گا۔''

جالپا کھل اٹھی۔ رما نے بڑے شوق سے اسے پھولوں کے زیور پہنانے شروع

کیے۔ پھولوں کے نازک اور طراوت آمیز احساس سے جالپا کے تن نازک میں گدگدی سی ہونے لگی۔ انہی پھولوں کی طرح اس کے جسم کا ایک ایک ذرہ کھل اٹھا۔

رما نے مسکرا کر کہا۔ ''کیا انعام دیتی ہو؟''

جالپا نے کچھ جواب نہ دیا۔ سامنے کمرے میں لیمپ جل رہا تھا۔ وہ اٹھ کر کمرے میں گئی اور آئینے کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ نشہ کی ترنگ میں کچھ ایسا ہوا کہ ''میں سچ مچ پھولوں کی دیوی ہوں' وہ زور سے قہقہہ مار کر ہنسنے لگی۔''

رما کو اس وقت اپنی دغا بازی پر ندامت ہو رہی تھی۔ جالپا نے کمرے سے لوٹ کر اس کی طرف مخمور نگاہوں سے دیکھا تو اس نے منہ پھیر لیا۔ ان بے لوث اور پر اعتقاد آنکھوں کے سامنے وہ آنکھیں نہ اٹھا سکا۔

جالپا نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا ''مہرے بابو جی تمہیں دیکھ کر گئے اور ماں سے تمہاری تعریف کرنے لگے تو میں سوچتی تھی۔ تم کیسے ہوگے۔ دل میں طرح طرح کی تصویریں آتی تھیں۔''

رما نے ایک لمبی سانس کھینچی اور جواب نہ دیا۔

جالپا نے اسی سادگی کے انداز سے کہا۔ ''میری سہیلیاں تمہیں دیکھ لبھائیں۔ شہزادی تو کھڑکی کے سامنے سے ہٹتی ہی نہ تھی' جب تم اندر گئے تھے تو اسی نے تمہیں پان کے بیڑے دیئے تھے۔ یاد ہے؟''

رما نا تھ نے کوئی جواب نہ دیا جالپا پھر بولی۔ ''اجی وہی جو رنگ روپ میں سب سے اچھی تھی۔ جب تم نے اس کی طرف رسیلی آنکھوں سے دیکھا تو بیچاری

شرم کے مارے گڑ گئی۔ مجھ سے کہنے لگی۔ جیجا جی تو بڑے رنگین مزاج معلوم ہوتے ہیں۔ سہیلیوں نے اسے خوب چڑایا۔ یاد ہے؟''

رمانا تھ نے گویا ندی میں ڈوبتے ہوئے کہا۔ ''مجھے یاد نہیں آتا۔''

''اچھا اب کے چلو گے تو دکھادوں گی۔ آج تم بازار گئے تھے کہ نہیں؟''

رما نے سر جھکا کر کہا۔ ''آج تو فرصت نہیں ملی۔''

''جاؤ، میں تم سے نہ بولوں گی۔ روز حیلے حوالے کرتے ہو۔ اچھا کل تو لا دو گے؟''

رمانا تھ کا دل مسوس اٹھا۔ یہ غریب چند ہار کے لیے اس قدر بیتاب ہو رہی ہے اسے کیا خبر؟ بخت نارسا اسے تباہ کرنے کا سامان کر رہا ہے۔

آدھی رات گزر چکی تھی۔ چاند کسی چور کی طرح ایک درخت کی آڑ سے جھانک رہا تھا۔ جالپا شوہر کے گلے میں ہاتھ ڈالے ہوئے سرمست خواب تھی۔ رما آہستہ سے اٹھا، مگر نیند کی گود میں سوئی ہوئی نازنین نے اسے متلون کر دیا۔ وہ ایک لمحہ تک کھڑا ہفتوں نظروں سے جالپا کی طرف دیکھتا رہا۔ نیند میں وہ پھول کتنا شگفتہ ہو گیا تھا۔ کمرے سے اندر قدم نہ رکھ سکا۔ پھر لیٹ گیا۔

جالپا نے چونک کر پوچھا۔ ''کہاں جاتے ہو کیا سویرا ہو گیا؟''

''ابھی تو بڑی رات ہے۔''

''تو تم بیٹھے کیوں ہو؟''

''کچھ نہیں، ذرا پانی پینے گیا تھا۔''

جالپا نے اس کے گلے میں ہاتھ ڈال دیئے اور اسے سہلا کر کہا۔ ''تم اس طرح

مجھ پر ٹونا کرو گے تو میں بھاگ جاؤں گی۔ بسنتی سچ کہتی تھی، مردوں کی آنکھوں میں جادو ہوتا ہے۔''

رمانا تھ نے روتے ہوئے دل کو سمجھا کر کہا۔ ''کیا کروں، آنکھوں کی پیاس نہیں بجھتی۔''

دونوں پھر لیٹے۔ ایک نشہ الفت میں متوالی، دوسرا فکر کے سمندر میں ڈوبا ہوا۔

تین گھنٹے اور گزر گئے۔ دواد شی کے چاند نے اپنا شراغ بجھا دیا۔ آدھی رات تک جاگنے والا بازار بھی سو گیا۔ صرف رما ابھی تک جاگ رہا تھا۔ دل میں طرح طرح کے وسوسے پیدا ہونے کے باعث وہ بار بار اٹھتا تھا اور پھر لیٹ جاتا تھا۔ آخر جب چار بجے کی آواز کان میں آئی تو گھبرا کر اٹھا اور کمرے میں جا پہنچا۔ زیوروں کا صندوقچہ الماری میں رکھا ہوا تھا۔ رما نے اسے اٹھا لیا اور تھر تھر کانپتا ہوا اسے لے کر نیچے اتر گیا۔ اس عجلت میں اسے اتنی فرصت نہ ملی کہ وہ چار چیزیں چھانٹ کر نکالے۔

دیانا تھ نیچے برآمدے میں سو رہے تھے۔ رما نے انہیں آہستہ سے جگایا' انہوں نے ہکا بکا ہو کر پوچھا ''کون؟''

رمانا تھ نے ہونٹ پر انگلی رکھ کر کہا۔ ''میں ہوں' یہ صندوقچی اٹھا لیا' رکھ لیجیے۔''

دیانا تھ صورتحال سمجھ گئے۔ رمانا تھ نے جس وقت ان سے زیوروں کے اٹھا لے جانے کا ذکر کیا تو انہوں نے سمجھا تھا کہ یہ محض حیلے کر رہا ہے۔ انہیں اس کا یقین نہ آیا تھا کہ یہ ارادے کو پورا کر دکھائے گا۔ ایسی کمینہ حرکتوں سے وہ علیحدہ رہنا چاہتے

تھے۔ پوچھا۔ ''اسے کیوں اٹھا لائے؟''

''آپ ہی نے تو فرمایا تھا۔''

''جھوٹ کہتے ہو۔''

''تو پھر رکھ آؤں؟''

رمانا تھ کے اس سوال نے منشی جی کو مخمصہ میں ڈال دیا۔ جھینپتے ہوئے بولے۔ ''اب کیا رکھ آؤ گے؟ کہیں دیکھ لے تو غضب ہی ہو جائے۔ وہی کام کرو گے جس میں رسوائی ہو۔ اب کھڑے کیا ہو۔ صندوقچی میرے بڑے صندوق میں رکھ آؤ اور جا کر لیٹ رہو۔''

برآمدے کے پیچھے دیا ناتھ کا کمرہ تھا۔ اس میں دیار کا ایک پرانا صندوق رکھا ہوا تھا۔ رما نے صندوقچی اس کے اندر رکھ دی اور بڑی تیزی سے اوپر چلا گیا۔ چھت پر پہنچ کر اس نے آہٹ لی۔ جالپا ابھی پچھلے پہر کے خواب نوشیں کے مزے لے رہی تھی۔

رما جوں ہی چارپائی پر بیٹھا۔ جالپا چونک کر اس سے چمٹ گئی۔

رما نے پوچھا۔ ''کیا ہے تم چونک کیوں پڑیں؟''

جالپا نے ادھر ادھر شبہ آمیز نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ ''کچھ نہیں ایک خواب دیکھ رہی تھی۔ کتنی رات ہے ابھی؟''

رما نے لیٹتے ہوئے کہا۔ ''سویرا ہو رہا ہے، کیا خواب دیکھتی تھیں؟''

جالپا نے شرماتے ہوئے کہا۔ ''جیسے کوئی چور میرے گہنوں کی صندوقچی اٹھائے لیے جاتا ہے۔''

رما کا دل اتنے زور سے دھک دھک کرنے لگا کہ گویا اس پر ہتھوڑے پڑ رہے ہوں۔خون سرد ہوگیا۔وہ زور سے چلا اٹھا ''چور، چور.....''

نیچے برآمدے میں منشی جی بھی چلا اٹھے۔''چور چور۔''

جالپا گھبرا کر اٹھی' دوڑی ہوئی کمرے میں گئی۔ایک جھٹکے میں الماری کھولی' صندوقچی وہاں موجود نہ تھی بے ہوش ہوکر گر پڑی۔

(8)

صبح ہوتے ہی دیا ناتھ گہنے لے کر صراف کے پاس پہنچے اور حساب ہونے لگا۔صراف کے پندرہ سو روپے آتے تھے' مگر وہ صرف پندرہ سو روپے کے زیور لے کر راضی نہ ہوا۔بکے ہوئے زیوروں کو بٹے پر ہی لے سکتا تھا۔بکی ہوئی چیز کون واپس لیتا ہے۔جا کڑ پہ دیئے ہوتے تو دوسری بات تھی۔ان چیزوں کا تو سودا ہو چکا تھا' اس نے کچھ ایسے تاجرانہ اصول کی باتیں کیں اور دیا ناتھ کو کچھ ایسا شکنجہ میں کسا کہ بیچارے کو ہاں ہاں کرنے کے سوا اور کچھ نہ سوجھی۔دفتر کا بابو شاطرانہ دکاندار سے کیا پیش پاتا۔پندرہ سو میں ڈھائی ہزار کے گہنے بھی چلے گئے۔اوپر سے پچاس روپے اور باقی رہ گئے۔اس مسئلے پر باپ بیٹے میں کئی دن خوب مباحثے ہوئے۔دونوں ایک دوسرے کو الزام دیتے' کئی دن آپس میں بول چال بند رہی۔مگر اس چوری کا حال پوشیدہ رکھا گیا۔پولیس کو خبر ہو جاتی تو بھانڈا پھوٹ جاتا۔جالپا سے یہی کہا گیا کہ مال تو دستیاب نہ ہوگا' مفت کی زحمت ہوگی۔

جالپا کو زیوروں سے جتنی الفت تھی' اتنی شاید دنیا کی اور کسی چیز سے نہ تھی اور اس میں تجمن کی کون سی بات تھی۔جب وہ تین سال کی نادان بچی تھی' اس وقت اس

کے لیے سونے کے چوڑے بنوائے گئے تھے۔ دادی جب اس کو گود میں کھلانے لگتی تو زیوروں ہی کی چرچا کرتی۔ ''تیرا دولہا تیرے لیے اچھے گہنے لائے گا' تو ٹھمک ٹھمک کر چلے گی۔''

جالپا پوچھتی۔ ''چاندی کے ہوں گے یا سونے کے دادی؟''

دادی کہتی۔ ''سونے کے ہوں گے بیٹی۔ چاندی کے کیوں لائے گا؟ چاندی کے لائے تو تم اٹھا کر اس کے منہ پر پٹک دینا۔''

مانکی چھیڑ کر کہتی۔ ''چاندی کے تو لائے گا ہی۔ سونے کے اسے کہاں ملے جاتے ہیں؟''

جالپا رونے لگتی۔ اس پر بوڑھی دادی' مانکی گھر کی مہریاں' پڑوسنیں اور دین دیال سب ہنس پڑتے۔ ان لوگوں کی تفریح کا یہ لازوال سرچشمہ تھا۔

لڑکی جب ذرا اور سیانی ہوئی تو گڑیوں کے بیاہ چانے لگی۔ لڑکے کی طرف سے چڑھاوے آتے۔ وہ دلہن کو گہنے پہناتی اور ڈولی میں بٹھا کر رخصت کرتی۔ کبھی کبھی دلہن گڑیا اپنے دولہا گڈے سے زیوروں کے لیے روٹھ جاتی۔ گڈا بے چارہ کہیں نہ کہیں سے زیور لا کر دلہن کو خوش کرتا تھا۔ انہیں دنوں بساطی نے اسے وہ چندن ہار دیا' جو اب تک اس کے پاس محفوظ تھا۔

جب رابڑی ہوئی تو بڑی بوڑھیوں میں بیٹھ کر زیوروں کے چرچے سننے لگی۔ عورتوں کی اس چھوٹی سی دنیا میں اس کے سوا اور کوئی مشغلہ نہیں تھا۔ کس نے کون کون سے زیور بنوائے؟ کتنا صرف ہوا؟ ٹھوس ہیں یا پورے؟ جڑاؤ ہیں یا سادے؟ سونے کے ہیں یا چاندی کے؟ انہی اہم مسائل پر ہمیشہ تنقید و تبصرے

ہوتے رہتے تھے۔کوئی دوسرا تذکرہ اتنا دلچسپ اتنا مزیدار ہو ہی نہ سکتا تھا۔

اس مرصع دنیا میں پلی ہوئی جالپا کی یہ زیور پسندی بالکل فطری تھی۔مہینہ بھر سے زیادہ ہو گیا' پر ابھی اس کا زخم تازہ ہے۔برائے نام کچھ کھا پی لیتی ہے' برائے نام ہنس بول لیتی ہے' دن بھر چارپائی پر پڑی آسمان کی طرف تاکتی رہتی ہے۔سارا گھر سمجھا کر ہار گیا' پڑوسنیں سمجھا کر ہار گئیں' دین دیال آ کر سمجھا گئے۔پر جالپا کے درد میں کوئی افاقہ نہ ہوا۔اسے اب گھر میں کسی پر اعتبار نہیں ہے۔یہاں تک کہ وہ رما سے بھی کھچی ہوئی رہتی ہے۔وہ سمجھتی ہے' سارا گھر اس سے بے اعتنائی کر رہا ہے۔سب کے سب اس کی جان کے گاہک ہو رہے ہیں۔جب ان کے پاس اتنی دولت ہے تو پھر اس کے گہنوں کو کیوں نہیں بنوا دیتی۔جسے ہم سب سے زیادہ پیار کرتے ہیں' اسی پر سب سے زیادہ ناراض بھی ہوتے ہیں۔جالپا کو سب سے زیادہ غصہ رما نا تھ پر تھا۔اگر یہ اپنے ماں باپ سے زور دے کر کہتے تو کوئی ان کی بات نہ ٹال سکتا۔مگر یہ کچھ کہیں بھی' ان کے منہ میں تو دہی جمایا ہوا ہے' مجھ سے محبت ہوتی تو یوں بے فکر نہ بیٹھے رہتی۔جب تک ساری چیزیں نہ بنوا لیتے' رات کو نیند نہ آتی۔ آخر جائیں گے تو اپنی ہی طرف' میں کون ہوں۔

وہ رما سے صرف کبیدہ خاطر ہی نہ رہتی' وہ اس کی دلجوئی کرتا تو دو چار جلی کٹی سنا دیتی۔بے چارہ اپنا سا منہ لے کر رہ جاتا۔غریب اپنی ہی لگائی ہوئی آگ میں جلا جاتا تھا۔اگر وہ جانتا کہ اس کی ڈینگوں کا یہ نتیجہ ہو گا تو زبان پر مہر لگا لیتا۔یہ غم اس کے لیے سوہان روح ہو رہا تھا۔کہاں صبح سے شام تک ہنسی قہقہہ' سیر سپاٹے میں کٹتے تھے۔کہاں اب نوکری کی تلاش میں ٹھوکریں کھاتا پھرتا تھا۔ساری مستی

غائب ہوگئی۔ تین ہزار کے زیور کیسے بنیں گے؟ اگر نوکر بھی ہوا تو ایسا کون سا بڑا عہدہ مل جائے گا۔ تین ہزار تو شاید تین پشتوں میں بھی جمع نہ ہوں۔ وہ کوئی ایسی تدبیر سوچ نکالنا چاہتا تھا جس سے وہ جلد سے جلد بے حساب دولت کا مالک ہو جائے۔ کہیں اس کے نام کوئی لاٹری نکل آتی تو پھر تو وہ جالپا کو زیوروں سے مڑھ دیتا۔ سب سے پہلے چندن ہار بنواتا۔ اس میں ہیرے جڑوا دیتا۔ اگر آج اسے جعلی نوٹ بنانا آ جاتا تو ضرور بنا کر چلا جاتا۔

ایک دن وہ شام تک نوکری کی تلاش میں مارا مارا پھرتا رہا۔ شطرنج کی بدلوت اس کے کتنے ہی اچھے اچھے آدمیوں سے یارانہ ہو گیا تھا' لیکن وہ شرم و لحاظ کے مارے کسی سے اظہار حال نہ کرتا۔ یہ بھی جانتا تھا کہ یہ خاطر داریاں اسی وقت تک ہیں' جب تک وہ کسی کے سامنے مدد کے لیے ہاتھ نہیں پھیلاتا۔ یہ آن ٹوٹی تو پھر کوئی بات نہ پوچھے گا۔ کوئی ایسا نکتہ رس آدمی نہ نظر آتا تھا' جو سارے کیفیت قیافے سے تاڑ جائے اور اسے کوئی معقول جگہ دلوا دے۔ آج وہ بہت رنجیدہ تھا۔ دوستوں پر ایسا غصہ آ رہا تھا کہ ایک ایک کو پھٹکارے اور آئیں تو دروازے ہی سے دھتکار دے' مگر وہ ذرا غور کرتا تو اسے معلوم ہو جاتا کہ اس معاملے میں دوستوں کا اتنا قصور نہ تھا' جتنا خود اس کا۔ اس کا کوئی ایسا دوست نہ تھا' جس سے اس نے بڑھ بڑھ کر باتیں نہ بنائی ہوں۔ یہ اس کی عادت تھی۔ گھر کی اصلی کیفیت کو وہ بدنامی کے داغ کی طرح چھپاتا رہا اور اب وہ کسی سے اپنا درد دل نہیں کہہ سکتا۔ گھر میں آ کر منہ لٹکائے ہوئے بیٹھ گیا۔

جاگیشری نے پانی لا کر رکھ دیا' اور پوچھا۔ ''آج تم دن بھر کہاں رہے بیٹا؟

ہاتھ منہ دھوڈالو۔''

رما نے لوٹا اٹھایا ہی تھا کہ جالپا نے آ کر تند لہجہ میں کہا۔ ''مجھے میرے گھر پہنچا دو اسی وقت۔''

رما نے لوٹا رکھ لیا اور اس کی طرف تکنے لگا گویا بات اس کی سمجھ میں نہ آئی ہو۔

جاگیشری بولی۔ ''کیسی بات کہتی ہو بہو' بھلا اس طرح کہیں بہو بیٹیاں بدا ہوتی ہیں۔''

جالپا نے جھلاہٹ سے کہا۔ ''میں ان بہو بیٹیوں میں سے نہیں ہوں۔ میرا جس وقت جی چاہے گا' جاؤں گی۔ جس وقت جی چاہے گا' آؤں گی۔ جب یہاں کوئی میری بات نہیں پوچھتا تو میں بھی کسی کو اپنا نہیں سمجھتی۔ میں چڑیا نہیں ہوں' جس کا پنجرہ اور دانہ پانی رکھ کر بند کر دیا جائے۔ میں بھی آدمی ہوں۔ اب اس گھر میں ایک لمحہ بھر نہ رہوں گی۔ اگر کوئی میرے ساتھ نہ جائے گا تو میں اکیلی ہی چلی جاؤں گی۔ راہ میں کوئی بھیڑیا نہیں بیٹھا ہے' جو مجھے اٹھا لے جائے گا۔''

رما نے پوچھا۔ ''آخر کچھ معلوم بھی تو ہو کیا بات ہے؟''

''بات کچھ نہیں ہوئی۔ اپنا جی ہے' یہاں نہیں رہنا چاہتی۔''

''بھلا اس طرح جاؤ گی تو تمہارے گھر والے کیا کہیں گے' یہ تو سوچو؟''

''یہ سب سوچ چکی ہوں اور زیادہ نہیں سوچنا چاہتی۔ میں جا کر اسباب باندھتی ہوں اور اسی گاڑی سے جاؤں گی۔''

یہ کہہ کر جالپا اوپر چلی گئی۔ رما بھی پیچھے یہ سوچتا ہوا چلا کہ اس کا غصہ کیسے ٹھنڈا کروں۔

جالپا اپنے کمرے میں جا کر بستر باندھ رہی تھی کہ رما نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا۔ ''تمہیں میری قسم جو اس وقت جانے کا نام لو۔''

جالپا نے تیوری بدل کر کہا۔ ''تمہاری قسم کی مجھے پروا نہیں ہے۔''

اس نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور پھر بستر لپیٹنے لگی۔ رما کھسیانا سا ہو کر ایک کنارے کھڑے ہو گیا۔ جالپا نے بستر بند سے بستر کو باندھا اور اپنا صندوق صاف کرنے لگی، مگر اس میں اب وہ پہلے سی تیزی نہ تھی۔ صندوق کو بار بار بند کرتی اور کھولتی تھی۔ بارش بند ہو چکی تھی۔ صرف چھت پر رکا ہوا پانی ٹپک رہا تھا۔

آخر وہ بستر کے بنڈل پر بیٹھ گئی اور بولی۔ ''تم نے مجھے قسم کیوں دلائی؟''

رما کے دل میں امید کی گدگدی پیدا ہوئی۔ بولا۔ ''اس کے سوا تمہیں روکنے کا میرے پاس اور کوئی ذریعہ نہ تھا۔''

''کیا تم چاہتے ہو، میں یہیں گھٹ گھٹ کر مر جاؤں؟''

''تم ایسے منحوس الفاظ کیوں منہ سے نکالتی ہو۔ میں تو چلنے کے لیے تیار ہوں۔ مگر کم سے کم ان لوگوں سے تو پوچھ لوں۔''

بجھتی ہوئی آگ پر تیل پڑ گیا۔ جالپا ترش ہو کر بولی۔ ''وہ میرے کون ہوتے ہیں کہ میں ان سے پوچھوں۔''

رما نے پوچھا۔ ''کوئی نہیں ہوتے؟''

جالپا نے بے اعتنائی سے جواب دیا۔ ''کوئی نہیں۔ اگر کوئی ہوتے تو میری طرف سے یوں دل نہ چھوٹا کرتے۔ اس قید میں پاگل ہو جاؤں گی۔ نہ کہیں آنا، نہ جانا، نہ کسی سے بات چیت۔ یہ صورت تو مجھ سے نہیں دکھائی جاتی۔ آخر دو لڑکے

اور بھی تو ہیں، ان کے لیے بھی تو کچھ جوڑیں گے۔''

رما کو بڑی بڑی باتیں کرنے کا پھر موقع ملا، بولا ''شاید تمہارا خیال ٹھیک ہے۔ نہیں تو ڈھائی تین ہزار ان کے لیے کیا بڑی بات تھی؟''

''مگر ہیں مکھی چوس پرلے درجے کے۔''

''مکھی چوس نہ ہوتے تو اتنی دولت کہاں سے آتی۔''

''مجھے تو کسی کی پروا نہیں ہے جی۔ ہمارے گھر کس بات کی کمی ہے۔ جب تمہاری نوکری لگ جائے تو مجھے بلا لینا۔''

''تلاش کر رہا ہوں۔ کتنے ہی بڑے آدمیوں سے ملاقات ہے۔ یہی ہے ذرا اچھی جگہ چاہتا ہوں۔''

''میں ان لوگوں کا رخ سمجھتی ہوں۔ میں بھی یہاں اب دعوے کے ساتھ رہوں گی۔ کسی سے ذکر کیا؟''

''شرم آتی ہے کسی سے کہتے ہوئے۔''

''اس میں شرم کی کون سی بات ہے، کہتے شرم آتی ہو تو رقعہ لکھ دو۔''

رما اچھل پڑا۔ کتنی آسان تدبیر تھی اور ابھی تک یہ سیدھی سی بات اسے نہ سوجھی تھی۔ بولا۔ ''ہاں! یہ تم نے اچھی ترکیب بتائی۔ کل ضرور لکھوں گا۔''

جالپا بولی۔ ''تم آج ہی تھوڑی لوٹ آؤ گے۔''

رما بولا۔ ''کیا تم سچ مچ جاؤ گی؟ تو مجھے نوکری مل چکی اور میں خط لکھ چکا۔ تمہارے فرق میں بیٹھ کر روؤں گا کہ نوکری ڈھونڈوں گا۔ نہیں اس وقت جانے کا خیال چھوڑو۔ نہیں سچ کہتا ہوں میں، کہیں بھاگ جاؤں گا۔ گھر کا حال دیکھ چکا

تھا۔تمہارے سوا اب اور کون بیٹھا ہوا ہے کہ جس کے لیے یہاں پڑا رہوں۔ہٹو تو ذرا میں بستر کھول دوں۔''

جالپا نے بستر پر سے ذرا کھسک کر کہا۔''میں بہت جلد چلی آؤں گی۔تم گئے اور میں آئی۔''

رما بستر کھولتا ہوا بولا۔''جی نہیں معاف کیجیے۔اس دھوکے میں میں نہیں آتا۔''

جالپا نے احسان جتاتے ہوئے کہا''تم نے میرا بندھا بندھایا بستر کھول دیا۔ نہیں تو آج کتنے مزے سے گھر پہنچ جاتی۔میں نے آج پکا ارادہ کرلیا تھا۔''

رما نے پان کھایا اور اپنے کمرے میں آکر دوستوں کو خط لکھنے لگا۔

(9)

رمانا تھ کے شناساؤں میں ایک رمیش بابو میونسپل بورڈ کے ہیڈ کلرک تھے۔عمر تو چالیس سال سے اوپر تھی، مگر تھے بڑے شوقین۔شطرنج کھیلنے بیٹھ جاتے تو سویرا کر دیتے۔دفتر کی بھی یاد نہ رہتی۔نہ کوئی آگے نہ پیچھے۔جوانی میں بیوی مر گئی تھی۔ دوسری شادی نہیں کی۔اس تجرد کی زندگی میں تفریحی مشاغل کے سوا دلچسپی کا اور کیا سامان تھا۔رما سے ان کی بڑی بے تکلفی تھی۔وہاں کوئی ایسا نٹھلا تھا، وج رات رات بھر ان سے شطرنج کھیلتا۔کئی دن سے بیچارے بہت بےقرار ہو رہے تھے۔نہ رما آیا اور نہ شطرنج کی کوئی بازی ہوئی۔اخبار کہاں تک پڑھتے۔سوچا اب رما میرے پاس کیوں آنے لگا۔کئی بار جی میں آیا کہ اسے بلوائیں۔مگر یہ سوچ کر کہ وہ کیوں آنے لگا رہ گئے۔کہاں جائیں۔سوچا سینما ہی دیکھ آئیں۔کسی طرح دن تو کٹے۔سینما سے انہیں بہت رغبت نہ تھی، مگر اس وقت انہیں سینما کے سوا اور کچھ نہ

سوجھا۔ کپڑے پہنے اور جانا ہی چاہتے تھے کہ رما نے کمرے میں قدم رکھا۔

رمیش اسے دیکھتے ہی گیند کی طرح لڑھک کر دروازے پر جا پہنچے اور اس کا ہاتھ پکڑ کر بولے۔ ''آؤ جی آؤ۔ تم اس بڈھے کو بھول ہی گئے۔ ہاں بھائی اب کیوں آؤ گے۔ معشوق کی رسیلی باتوں کا مزہ یہاں کہاں۔ چوری کا کچھ پتا چلا؟''

رما نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔ ''کچھ بھی نہیں۔''

رمیش بابو نے چھوٹی میز اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ ''بہت اچھا ہوا تھا نے میں رپٹ نہیں لکھائی۔ نہیں سو دو سو کے ماتھے اور جاتی۔ دلہن کو تو بہت رنج ہوا ہوگا؟''

''کچھ پوچھیے مت۔ میں تو تنگ آ گیا۔ بابو جی سنتے ہی نہیں۔''

''بابو جی کے پاس کیا قارون کا خزانہ رکھا ہوا ہے۔ دس بیس ہزار روپے ہوں گے تو۔ ابھی دو بچے بھی تو سامنے ہیں۔ نوکری کا بھروسہ ہی کیا۔''

''میں تو مصیبت میں پھنس گیا' اب معلوم ہوتا ہے کہ کہیں نوکری کرنی پڑے گی۔ چین سے زندگی کٹتی تھی' نہیں تو بیٹھے بٹھائے اس جنجال میں پھنس گئے۔ بتلایئے' ہے کہیں نوکری چاکری کا سہارا؟''

رمیش نے طاق پر سے مہرے اور بساط اتارتے ہوئے کہا۔ ''آؤ ایک بازی ہو جائے پھر اس مسئلے پر غور کریں۔ اسے جتنا آسان سمجھ رہے ہو' اتنا آسان نہیں ہے۔''

رما ناتھ نے منہ پھیر کر کہا۔ ''میرا تو اس وقت کھیلنے کو جی نہیں چاہتا۔ اس وقت تک یہی فکر سر پر سوار ہے۔''

رمیش: ''لو شطرنج کے مہرے'' وہ بساط بچھاتے ہوئے بولے۔ ''آؤ بیٹھو! ایک بازی تو کھیل لو۔ پھر سوچیں گے کیا ہو سکتا ہے؟''

''ذرا بھی جی نہیں چاہتا۔ میں جانتا کہ سر منڈاتے ہی اولے پڑیں گے تو شادی کے قریب ہی نہ جاتا۔''

''دو چار چالیں چلو تو آپ ہی جی لگ جائے گا۔ ذرا عقل کی گانٹھ کھلے گی۔''

بازی شروع ہوئی۔ کئی معمولی چالوں کے بعد رمیش نے رما کا رخ پٹ دیا۔ رما نے میز پر ہاتھ ٹیک کر کہا ''اف! کا غلطی ہوئی ہے؟''

رمیش بابو کی آنکھوں میں نشہ کی سی سرخی پیدا ہونے لگی۔ شطرنج ان کے لیے شراب سے کم سرور انگیز نہ تھا۔ بولے۔ ''بہنی تو اچھا ہوئی۔ تمہارے لیے میں ایک تدبیر سوچ رہا ہوں۔ میرے ہی دفتر میں ایک جگہ خالی ہے' مگر مشاہرہ بہت کم ہے۔ محض تیس روپے۔ وہ خضابی ڈاڑھی والے خان صاحب ہیں۔ ان سے کام نہیں چلتا۔ سوچتا تھا جب تک کسی طرح کام چلا چلے' پڑا رہنے دوں۔ بال بچے والے آدمی ہیں۔ اس بیکاری کے زمانے میں کہاں مارے مارے پھریں گے' مگر وہ خود ہی نوکری سے بیزار ہو رہے ہیں۔ تمہارے لائق وہ جگہ نہیں ہے' مگر چاہو تو فی الحال کر لو۔''

یہ کہتے کہتے رما کا فیلہ مار لیا۔

رما نے فیلے کو پھر اٹھانے کی کوشش کر کے کہا۔ ''آپ مجھے باتوں میں لگا کر میرے مہرے اڑاتے جاتے ہیں۔ اس کی سند نہیں' لائیے میرا فیلہ۔''

''دیکھو بھائی بے ایمانی مت کرو۔ میں نے تمہارا فیلہ زبردستی تو نہیں اٹھا لیا۔

ہاں تو تمہیں وہ جگہ منظور ہے؟''

تنخواہ تو تیس ہی ہے۔

''ہاں تنخواہ تو کم ہے' مگر شاید کچھ دنوں کے بعد ترقی ہو جائے۔ میری تو رائے ہے کر لو۔ جگہ منظور ہے؟''

تنخواہ تو تیس ہی ہے۔

''ہاں تنخواہ تو کم ہے' مگر شاید کچھ دنوں کے بعد ترقی ہو جائے۔ میری تو رائے ہے کر لو۔ جگہ آمدنی کی ہے۔ خان صاحب نے تو اسی جگہ رہتے ہوئے لڑکوں کو ایم۔اے' ایل۔ایل۔بی کرالیا۔ لڑکیوں کی شادیاں اچھے گھروں میں کیں۔ ہاں ذرا سمجھ بوجھ سے کام کرنے کی ضرورت ہے۔''

رما نے بےغرضی جتلا کر کہا۔ ''آمدنی کی مجھے پروا نہیں۔ رشوت کوئی اچھی چیز نہیں۔''

رمیش بابو نے رما کی آنکھ بچا کر ایک مہرے کو آگے بڑھا کر کہا۔ ''بہت خراب' مگر عیال دار آدمی کیا کرے۔ میں اکیلا آدمی ہوں' میرے لیے ڈیڑھ سو کافی ہیں' لیکن جس گھر میں بہت سے آدمی ہوں۔ لڑکوں کی تعلیم ہو۔ لڑکیوں کی شادیاں ہوں۔ اس کے لیے رشوت کے سوا اور کیا چارہ ہے۔ جب تک چھوٹے چھوٹے آدمیوں کی تنخواہ اتنی نہ ہو جائے گی کہ وہ بھلمنسی کے ساتھ نباہ کر سکیں' تب تک رشوت بند نہیں ہو سکتی۔''

رما کا فرزین پٹ گیا۔ رمیش بابو نے زور سے قہقہہ مارا۔

رما نے جھلا کر کہا۔ ''اگر آپ چپ چاپ کھیلئے تو کھیلئے۔ ورنہ میں تو جاتا

ہوں۔ مجھے باتوں میں لگا کر سارے مہرے اڑا لیے۔''

رمیش نے دب کر کہا۔ ''اچھا صاحب اب بولو تو زبان پکڑ لیجیے۔ یہ لیجیے شہ۔ تو تم کل عرضی پیش کر دو۔ مگر جس دن جگہ ملے گی، میرے ساتھ رات بھر کھیلنا پڑے گا۔''

''آپ تو دو ہی ماتوں میں رونے لگتے ہیں۔''

''اجی وہ دن گئے، جب آپ مجھے مات دیا کرتے تھے۔ ادھر میں نے ایک منتر جگایا ہے۔ کیا مجال کوئی مات دے سکے۔ پھر شہ۔''

''جی تو شاہتا ہے کہ دوسری مات دے کر جاؤں، مگر دیر ہو گئی۔''

''دیر کیا ہو گئی؟ ابھی تو کل نو بجے ہیں۔ کھیل لو۔ دل کا ارمان نکل جائے۔ یہ اور مات۔''

''اچھا کل ہی رہی، کل للکار کر پانچ ماتیں نہ دی ہوں تو کہیے گا۔''

''اجی جاؤ بھی۔ تم مجھے کیا مات دو گے۔ ہمت ہو تو ابھی سہی۔''

''اچھا آیئے! آپ بھی کیا کہیں گے۔ مگر پانچ بازیوں سے کم نہ کھیلوں گا۔''

''پانچ نہیں تم دس کھیلو جی۔ رات تو اپنی ہے تو چلو پھر کھانا کھالیں۔ تب اطمینان سے بیٹھیں۔ تمہارے گھر کہلائے دیتا ہوں کہ آج یہیں سوئیں گے، انتظار نہ کریں۔''

دونوں نے کھانا کھایا اور شطرنج پر بیٹھے۔ پہلی بازی میں گیارہ بج گئے۔ رمیش کی جیت رہی۔ دوسری بازی بھی انہیں کے ہاتھ رہی۔ تیسری بازی ختم ہوئی تو دو بج گئے تھے۔ رما نے آنکھیں مل کر کہا۔ ''اب مجھے تو نیند آ رہی ہے۔''